Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اسی غرض کے واسطے تو ایاز جیسے لوگوں کی ضرورت ہے تاکہ حکومت کوئی ناجائز قدم اٹھائے تو اسے چیک کرنے کے لیے کوئی موجود ہو۔"

"آپ عجیب بات کر رہے ہیں۔" مبشر بولا، "حکومت کو چیک کرنے والے حکومت سے باہر ہوتے ہیں یا حکومت کے اندر؟"

"قابلیت رکھنے والے لوگ اگر حکومت کے اندر ہوں گے تو قابلِ اعتراض اقدامات کے عمل میں آنے کا موقع ہی نہیں ملے گا۔" فیاض نے کہا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اسے احساس ہونے لگا تھا کہ وہ اس تکرار میں ہارتا جا رہا ہے۔

"ایسے قابل لوگوں سے تو حکومت پہلے ہی بھری پڑی ہے۔" مبشر طنز سے بولا، "دراصل آپ کا مطلب صرف یہ ہے کہ ایاز بھی اس جتھے میں جا کر شامل ہو جائے۔"

"کیا مطلب؟"

"فیاض صاحب میں نے آپ کا ایڈیٹوریل پڑھا ہے جو آپ نے نئے آرڈی ننس کی حمایت میں لکھا ہے۔" مبشر بولا، "اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ کی رائے میں حکومت کے اندر انتہائی قابل لوگوں کی کوئی کمی نہیں اور یہ لوگ نہایت مستحسن اقدامات کر رہے ہیں۔ پھر اس صورت میں ایاز صاحب کی کیا ضرورت ہے؟"

ایاز کے گھر پہ ایسے مباحثے اکثر ہوا کرتے تھے۔ مگر عموماً ان کا رنگ غیر جانبدارانہ اور خاص طور پہ غیر ذاتی ہوا کرتا تھا اور پرانے قانون دانوں کے اس گھر میں یہ ایک کھیل کی حیثیت رکھتے تھے۔ مگر مبشر کے یہ الفاظ فیاض کی دیانت داری اور خلوص کے اوپر ذاتی حملے کے برابر تھے۔ میز کے گرد سب لوگ دم بخود بیٹھے تھے۔ فیاض کو جواب دینے کا کوئی راستہ نہ سوجھ رہا تھا۔ ایاز جو ایسے موقعوں پہ عموماً مبشر کی حمایت کیا کرتا تھا، اب اپنی کرسی سے ٹیک لگائے ایک ہاتھ میں چمچہ لیے اسے ہلاتا ہوا خاموش بیٹھا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک تھی، جیسے وہ اس بحث کو ختم کرنا چاہتا ہو، مگر ساتھ ہی اس کی ناگواری کا لطف بھی لے رہا ہو۔ اس نے بہرحال اس قضیے کو رفع دفع کرنے کے لیے کوئی قدم نہ اٹھایا۔ مبشر اسی طرح چمچہ ہاتھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں اٹھائے تعجب سے باری باری ہر ایک کا منہ تک رہا تھا۔ اس وقت اندر کے ایک کمرے سے گویا خدائی امداد کے طور پر ایک بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ چند لمحوں کا جکڑا آناً فاناً ہی ٹوٹ گیا۔ سب لوگ ایک ساتھ حرکت میں آ گئے۔ نسیم اچھل کر اٹھی اور اندر بھاگ گئی۔ کلثوم نے کھیر کا ڈونگہ اٹھایا اور ہنس کر بولی: "بھئی باتوں کے جوش میں بیٹھا نہ بھول جائیے۔" خلیق ڈونگہ اس کے ہاتھ سے پکڑ کر اپنی جگہ پہ کھڑا ہو گیا اور تقریر کرنے کے انداز میں بولا: "بھائیو اور بہنو۔ ہم تو کھیر کھانے آئے ہیں۔ کھیر کھا کے چلے جائیں گے۔" جب وہ کرسی پہ بیٹھ رہا تھا تو اس کو احساس ہوا کہ اس کی بات موقعے کے مطابق نہ تھی اور اس سے شاید فیاض کی مزید تضحیک کا پہلو نکلتا تھا۔ چنانچہ اس نے جلدی میں ایک اور بھونڈا سا مذاق اپنے اوپر کیا اور خود ہی قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ ایاز اور اظہر بھی ہنسی میں شامل ہو گئے۔ پھر اظہر نے کوئی بات چھیڑ دی۔ نسیم روتے ہوئے بچے کو اٹھائے واپس آئی تو سب بچے کی جانب متوجہ ہو گئے۔ بچے کی آیا نسیم کے عقب میں چلتی ہوئی آئی مگر کھانے کے کمرے کے دروازے پر ہی رک گئی۔ بچہ سوتے میں ڈر گیا تھا۔ اظہر اس کے سامنے ناچ ناچ کر اسے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر سب نے باری باری بچے کو دھیان لگانے کی اپنی سی کوشش کی، حتیٰ کہ فیاض بھی اپنی جگہ پہ کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر انہیں پروں کی طرح ہلا ہلا کر مرغ کی بانگ دینے لگا۔ بچہ ان حرکات سے پریشان ہو کر چند لمحوں کے لیے چپ ہو گیا، پھر رونے لگا۔ چند منٹ کے اندر کھانے کے کمرے میں خوش دلی اور امن کی فضا بحال ہو گئی۔

ایاز کے چھوٹے بیٹے کا میرے ساتھ بہت لگاؤ تھا۔ کچھ دیر کے بعد جب اس نے رونا بند کیا تو اس کی ماں نے اسے سلانے کی کوشش کی، مگر اتنے لوگوں کو دیکھ کر بچے کی نیند اڑ چکی تھی۔ میں نے اٹھ کر ہاتھ آگے بڑھائے۔ بچہ میرے پاس آ گیا۔ میں اسے لے کر کرسی پہ بیٹھ گیا اور کھیر میں سے میوے چن چن کر اسے کھلانے لگا۔ میز پہ اب سیبوں اور سنگتروں کی رکابیاں آ گئی تھیں۔ فیاض اور بیشتر نے آہستہ آہستہ اب کھل کر بات کرنی شروع کر دی تھی۔ فیاض نے پچھلی بات کے سلسلے میں ایک آدھ مذاق بھی کیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جس کا مبشر نے خوش دلی سے جواب دیا۔ ابھی سب میز پر ہی بیٹھے تھے کہ اظہر نے روانگی کا اعلان کر دیا۔ چاروں طرف سے رسمی مایوسی کا اظہار کیا گیا: "گھر کا آدمی ہونے کے یہ مزے ہیں۔ کھایا اور اٹھ کے چل دیے۔" خلیق بولا۔ "ہم ایسا کرنے کی جرأت کریں تو بولیں اب کیا ہوٹل سمجھ رکھا ہے۔" اظہر ہنسنے لگا۔ نسیم خلیق کی جانب انگلی ہلا کر بولی، "آپ اپنی باتوں سے باز نہیں آتے نا، خلیق بھائی۔" خلیق نے بننے کے انداز میں سینے پر دونوں ہاتھ جوڑ کر سر جھکا دیا۔ چند منٹ کے بعد اظہر اور کلثوم اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے ساتھ ساتھ باقی سب لوگ بھی رومالوں سے ہاتھ پونچھتے اور تیلیوں سے دانت صاف کرتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔ میں نے اپنی کرسی چھوڑ کر اٹھنے کی کوشش کی تو بچہ منہ بسورتا ہوا میز پر پڑے چھری کانٹوں کی جانب، جن سے وہ کھیل رہا تھا، لپک پڑا۔ میں دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اظہر اور کلثوم نے جاتے جاتے بچے کو پیار کیا۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے انہیں الوداع کہہ دیا۔ سب لوگ کھانے کے کمرے سے نکل گئے، صرف میں بچے کو گود میں لیے بیٹھا رہ گیا۔ باہر والے کمرے سے شب بخیر کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اظہر اور کلثوم رخصت ہو رہے تھے۔ پھر دروازہ بند ہو گیا۔ باہر کار چلنے کی آواز آئی۔ باقی لوگ اب اندر آ کر آتشدان کے پاس بیٹھ گئے تھے۔ نسیم کافی بنانے کے لیے باورچی خانے چلی گئی۔ میں چھری کانٹوں کی مدد سے میز پر مختلف شکلیں بنا کر بچے کے ساتھ کھیلتا اور باتیں کرتا رہا۔ میرے اور اس کے درمیان ایک بڑا رشتہ کہانی سنانے کا تھا۔ کھیلتے کھیلتے اسے کہانی یاد آ گئی اور وہ اصرار کرنے لگا۔ میں نے اسے ایک مختصر سی کہانی سنانی شروع کر دی۔ دوسرے کمرے سے ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ نسیم جب کافی لے کر گزری تو بولی: "چلیے بھائی۔ یہ بچہ تو رات بھر آپ کو یہیں بٹھائے رکھے گا۔" میں اٹھ کر نسیم کے ہمراہ دوسرے کمرے میں چلا آیا۔ آگ بجھ رہی تھی۔ ایاز نے اندر سے خشک لکڑیاں لا کر آگ پر رکھ دیں۔ چند منٹ میں لکڑیاں شعلے دینے لگیں۔ بچہ ابھی تک میرے ساتھ چپکا بیٹھا تھا۔ میں ایک ہاتھ سے اسے سنبھالے دوسرے ہاتھ سے کافی پی رہا تھا۔ خلیق، مبشر اور ایاز اپنے کسی جاننے والے کا وکیل کا ذکر کر رہے تھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جس نے "کرکٹ پریکٹس" شروع کر رکھی تھی اور عدالتوں کی نظروں میں گرتا جا رہا تھا۔

میں نے کافی کی پیالی خالی کر کے میز پر رکھی تو میری نظر نسیم پر پڑی جو میری ڈائری میز سے اٹھا کر ہاتھ میں لیے بے خیالی سے اس کے ورق الٹ رہی تھی، اور ساتھ ساتھ فیاض سے باتیں کرتی جا رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد بچے کو نیند آنے لگی۔ اسے اونگھتے دیکھ کر نسیم اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بھئی میں تو اب چلی۔" وہ بچے کو میری گود سے لیتے ہوئے بولی۔

فیاض، خلیق اور بشیر اپنی جگہوں سے اٹھنے لگے تو وہ جلدی سے بولی، "بیٹھیے بھائی۔ آپ بیٹھیے۔ ایاز تو رات کو بارہ بجے سے پہلے نہیں سوتے مجھے نیند آجاتی ہے۔ خدا حافظ۔"

"بھابھی بہت بہت شکریہ کھانے کا۔" فیاض نے کہا۔

"بھئی نسیم اگلی بار کب آئیں۔" خلیق بولا، "دن بتا دو ابھی سے تیاری شروع کر دیں۔"

"بھوکا رہنے کی؟" فیاض نے پوچھا۔

"جب آپ کا دل چاہے تشریف لائیں۔ خلیق بھائی۔ آپ کا اپنا گھر ہے۔" نسیم نے کہا، "خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔" بشیر نیزی سے بولا۔

"خدا حافظ۔" نسیم نے پیار سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"خدا حافظ۔"

نسیم کے جانے کے بعد چند منٹ تک گفتگو میں وقفہ آگیا۔ پھر خلیق اور ایاز نے اپنی بات وہاں سے شروع کر دی جہاں پہ چھوڑی تھی۔ بشیر ان کی گفتگو سے نکل گیا تھا۔ وہ اب کرسی پہ خاموش بیٹھا حیرت سے آگ کے شعلوں کو دیکھ رہا تھا۔ فیاض نے فراغت کے ساتھ اپنے پائپ کو صاف کیا، پھر اس میں تمباکو بھر کر سلگا لیا۔ کمرے میں فیاض کے پائپ اور خلیق کے سگرٹوں کا دھواں بھر گیا تھا۔ میں اٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا اور اس کا ایک پٹ کھول کر باہر دیکھنے لگا۔ باہر سے گیلی گیلی خنک ہوا کا ایک جھونکا میرے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چہرے سے آکر ٹکرایا۔ میں نے کھڑکی میں کھڑے کھڑے متعدد لمبے لمبے سانس لیے۔ کمرے میں اب خلیق، ایاز اور فیاض کی دھیمی، شکم سیر آوازوں کی گنگناہٹ تھی۔ باہر بارش ایک بار رک کر دوبارہ شروع ہو رہی تھی۔ گھاس پر اور باغ کے درختوں پر اور سڑک سے گزرتی ہوئی سواریوں پر اور دور دور تک گھروں پر بارش کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔

"بارش ابھی ہو رہی ہے؟" ایاز نے پوچھا۔

"ہاں"۔ میں نے جواب دیا۔

سرد ہوا نے میرے بدن میں ہلکی سے کپکپی پیدا کر دی تھی۔ میں کھڑکی بند کر کے لوٹ آیا۔ ایاز، خلیق اور فیاض نے اب ملک کے عام حالات کے بارے میں باتیں شروع کر دی تھیں۔ مگر ان کی گفتگو زیادہ تر ذاتیات تک محدود تھی۔ کون کیا بن گیا ہے، کون کیا بن رہا ہے، اور کون کس چکر میں ہے۔ موضوع دلچسپ تھا۔ آہستہ آہستہ میں بھی اس میں شامل ہو گیا۔ مبشر اسی طرح سکتے کے عالم میں بیٹھا تھا۔ بعد میں اس نے دو ایک باتیں کیں، مگر بیشتر وقت وہ قناعت سے خاموش بیٹھا رہا۔ رات کے کھانے اور دوستوں کی مجلس نے میرے دل کی حالت سنوار دی تھی۔ ہم سب کے چہروں پہ گہرے اطمینان اور خوشی کی کیفیت تھی اور ہماری گفتگو دھیمی، سپاٹ اور بے مقصد تھی۔ اس خوش کن ماحول میں وقت کا پتا نہ چلا۔ ایک گھنٹہ گزر گیا۔

آخر خلیق نے اپنے آخری عمل کے طور پہ مہندی لگے بالوں میں انگلیاں دوڑائیں اور فیاض سے بولا:

"کیا خیال ہے بھئی رات یہیں بسر کرنے کا ارادہ ہے؟"

فیاض، مبشر اور خلیق اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے بعد میں اٹھا۔ آخر میں ایاز اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ خلیق نے اوور کوٹ اور مبشر نے برساتی کا کوٹ پہن کر بٹن بند کر لیے۔

"اچھا بھئی۔" خلیق نے ہاتھ ایاز کی طرف بڑھایا، "خدا حافظ۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایاز نے اس سے ہاتھ ملایا۔ پھر اس نے فیاض اور مبشر سے ہاتھ ملایا۔ پھر میں نے ان تینوں سے ہاتھ ملائے۔ ایاز نے دروازہ کھولا۔ باہر بارش رک رک کر ہو رہی تھی۔ ہوا دروں پر تھی۔ ہوا کی خنکی کو محسوس کر کے ایاز نے ایک جھرجھری لی۔ خلیق کی موٹر برآمدے کے آگے کھڑی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر جلدی سے موٹر میں داخل ہو گیا۔ فیاض اس کے ساتھ آگے اور مبشر پیچھے کی سیٹ پر جا بیٹھا۔ کھٹاک کھٹاک دروازے بند ہوئے۔ پھر گاڑی سٹارٹ ہوئی۔ موٹر کے اندر ان تینوں نے، اور برآمدے میں میں نے اور ایاز نے ہاتھ ہلا کر الوداع کہا۔ موٹر گیلی مٹی اور پانی کے چھینٹے اڑاتی ہوئی گیٹ سے باہر نکل گئی۔ ایاز سڑک کو دیکھتا رہا۔ بارش رکنے لگی تھی مگر آخری دموں کی باریک پھوار ہوا کے تھپیڑوں کے ساتھ آدھے برآمدے تک آ رہی تھی۔ ایاز ہاتھ پتلون کی جیبوں میں دیے، برآمدے کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا۔ مجھے سردی محسوس ہونے لگی۔

"چلو یار۔" میں نے کہا، "بھیگنے کی صلاح ہے؟"

ایاز اسی طرح کھڑا رہا۔ موٹر کی عقبی روشنیاں موڑ کاٹ کر غایب ہو چکی تھیں۔ مگر ایاز کی نظریں اندھیرے پر لگی تھیں۔ اس نے چند گھنٹے اپنے پرانے اور عزیز دوستوں کی محفل میں گزارے تھے۔ اب آدھی رات کا وقت ہو گیا تھا اور ایک ایک کر کے سب اپنے گھروں کو روانہ ہو چکے تھے۔ رات سنسان پڑی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میں نے محسوس کیا گویا میں کسی اجنبی کو دیکھ رہا ہوں۔ ایاز کی ٹائی کی گانٹھ اس کے سینے پر لٹک رہی تھی۔ اس کے بال آدھے سے زیادہ سفید ہو چکے تھے اور اس کا چہرہ جوانی اور بڑھاپے کے طویل سنگم پر اٹکا کھڑا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں ایاز کے گھر کے برآمدے میں نہیں بلکہ کہیں اور، کسی نا واقف مقام پہ کھڑا ہوں۔ مجھے دنیا کے بے اصل ہونے کا احساس ہوا۔

"چلو۔" آخر ایاز بولا، "اب کون گیٹ بند کرنے جائے؟"

ہم دوبارہ کمرے میں داخل ہوئے تو محسوس ہوا کہ کمرہ باہر کی نسبت کتنا گرم تھا۔ دروازہ بند کر کے ایاز نے گھڑی پر نظر ڈالی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"بارہ بجنے والے ہیں۔" وہ جمائی لے کر بولا، "نسیم ــــ" اس نے عادتاً پکارا۔
"سو گئی ہے۔" وہ اپنے آپ سے بولا۔ "اچھا بھئی تمہارا تو پڑھنے لکھنے کا وقت اب ہو رہا ہے۔" وہ مجھ سے بولا، "میں تو چلا۔ کل ملاقات ہوگی۔ خدا حافظ۔"

مجھے پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ میں پانی کی تلاش میں باورچی خانے کی جانب بڑھا۔ گلاس میں پانی ڈالتے ہوئے میری نظر کھڑکی سے باہر گئی تو پچھلے برآمدے میں مجھے اندھیرے کے اندر ایک سر دکھائی دیا۔ میں نے ہاتھ روک کر غور سے دیکھا تو کوئی کرسی پہ بیٹھا تھا۔ برآمدے کا یہ حصہ دو طرف سے جالی لگا کر بند کر دیا گیا تھا اور دن کے وقت دھوپ میں بیٹھنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ میں نے بھرا ہوا گلاس میز پر رکھ دیا اور دبے پاؤں باورچی خانے کے پچھلے دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ آدھا کھلا تھا۔ میں نے دروازے سے سر نکال کر دیکھا۔ چند لمحے تک مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ جب میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو میں دروازے سے نکل کر ایک قدم آگے بڑھا۔ اب میں اندھیرے میں کھڑا تھا اور صاف طور پہ دیکھ سکتا تھا۔ یہ نسیم تھی۔ وہ کندھوں کے گرد شال لپیٹنے، دونوں بازو سینے پہ باندھے کرسی پر سیدھی بیٹھی تھی۔ اس کی گود میں میری ڈائری پڑی تھی۔

"نسیم۔" میں نے ہولے سے پکارا۔

اس نے ذرا سا منہ پھیر کر مجھے دیکھا، پھر جلدی سے پرے کر لیا۔ وہ رو رہی تھی۔ میرا ہاتھ بجلی کے بٹن کی طرف اٹھا، پھر رک گیا۔ میری نظریں بے خیالی میں ادھر ادھر بھٹکنے لگیں۔ آسمان پہ بادل پتلے ہو گئے تھے اور عقب سے چاند کی روشنی ان کے اندر پھیلنے لگی تھی۔ بارش بند ہو چکی تھی، مگر ہوا تندی سے چل رہی تھی۔ رات کے اندر درخت شائیں شائیں کر رہے تھے۔ فروری کا موسم اپنا رنگ دکھا رہا تھا۔ میں نے دوبارہ نسیم کو پکارنے کے لیے منہ کھولا، مگر خاموش رہا۔ وہ اسی طرح کرسی پہ سیدھے بدن بیٹھی تھی۔ اس کے جسم میں نہ حرکت تھی نہ آواز، جیسے دنیا سے الگ تھلگ بیٹھی ہو۔ میں اسے وہیں چھوڑ کر الٹے پاؤں لوٹ آیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کمرے میں واپس آکر میں آتش دان کے پاس کرسی پہ بیٹھ گیا۔ آگ بجھ چکی تھی۔ میں وہاں بیٹھا ایاز کا انتظار کرتا رہا۔ ابھی وہ نسیم کو پکارتا ہوا آئے گا، میں نے تصور کیا۔ نسیم باورچی خانے کی جانب سے نکلے گی۔ "کہاں چلی گئی تھیں؟" ایاز پوچھے گا۔ "یہیں پر تھی۔" نسیم آہستہ سے مسکرا کر جواب دے گی۔ "ذرا تازہ ہوا میں نکلی تھی۔" پھر وہ ایاز کے ہمراہ خواب گاہ کو لوٹ جائے گی۔

مگر ایاز کے آنے سے پہلے ہی میں اٹھ کر اپنے کمرے کو چلا آیا۔

اس بات کو بیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ ان بیس برسوں نے کیا کچھ نہیں دیکھ لیا۔ ایاز نے اس مقدمے میں ظفر کی جان بچالی، مگر ظفر کو عمر قید ہو گئی۔ اس کے کچھ عرصے بعد ایاز نے سرکاری عہدہ قبول کر لیا۔ وہ ایڈووکیٹ جنرل بنا۔ دو سال کے بعد اس نے استعفےٰ دے دیا اور دوبارہ پریکٹس کرنے لگا۔ پھر کچھ دیر کے بعد اس نے ایک نئی سیاسی جماعت میں شمولیت اختیار کر لی۔ انتخابات میں وہ پارٹی کے ٹکٹ پر لاہور کے ایک حلقے سے بھاری اکثریت کے ساتھ کامیاب ہوا۔ جب اس کی پارٹی کی حکومت بنی تو اسے وزیرِ قانون کا عہدہ ملا۔ کچھ دیر کے لیے وہ قائم مقام وزیرِ تجارت بھی رہا۔ کیا زمانہ تھا! ہم سب ہوا کے گھوڑے پہ سوار تھے۔ پھر یکایک وقت پلٹ گیا۔ اوپر کا نیچے اور نیچے کا اوپر ہو گیا۔ آجکل ایاز بدعنوانی کے الزام میں جیل کاٹ رہا ہے۔ اس نے بدعنوانی کی یا نہیں، یہ ایک الگ کہانی ہے۔ اختیار کی وسعت کے ساتھ ساتھ بدعنوانی کے نئے نئے عنوان مقرر ہوتے ہیں۔ مگر ایاز اپنی زندگی سے مطمئن نظر آتا ہے۔ اس نے اپنی قابلیت کو پوری طرح استعمال کیا اور اپنی اہلیت کی حد کو پہنچا۔ اس سے زیادہ آدمی کس بات کی امید کر سکتا ہے۔

میں مہینے میں ایک بار ایاز سے ملاقات کے لیے لاہور جاتا رہتا ہوں۔ اسے جیل میں بی کلاس ملی ہے۔ کل میں اس سے ملنے گیا تو اس کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ کہنے لگا، "بدہضمی ہے، اور کچھ نہیں۔ کم بختوں نے میرا کھانا پکانے والا پھر بدل دیا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے پوچھا اب کون آیا ہے، تو بولا "کوئی نیا بدھو ہے۔ بیوی کے قتل پر جیل کاٹ رہا ہے۔ کھانا پکانا بالکل نہیں جانتا۔ میں نے آج شکایت بھیجی ہے۔ میں نسیم کو تکلیف دینا نہیں چاہتا۔" پھر جیسے اچانک اس کو پرانا واقعہ یاد آگیا۔ کہنے لگا "تمہیں یاد ہے، ایک زمانے میں ہم نے ایک شخص کا کیس لڑا تھا جس نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا تھا؟" "مجھے یاد ہے۔" میں نے جواب دیا۔ کچھ دیر تک وہ اپنے کمرے کی چھوٹی سی کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا، جیسے یاد کر رہا ہو۔ پھر ہنس کر بولا "تم نے اس کیس میں خوب سراغ رسانی کی تھی۔" میں بھی ہنس پڑا۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ سارا واقعہ آگیا۔ ایاز اب اکثر مجھ سے ماضی کی باتیں کیا کرتا ہے، گویا اس وقت کی کسر پوری کر رہا ہو جب اسکے پاس بات کرنے کی فرصت نہ ہوتی تھی اور میں نسیم سے مل کر واپس آجایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ مجھ سے کہتا ہے، "تمہارے پاس ٹیلنٹ ہے۔ کیوں اپنا وقت ضائع کرتے ہو۔ اپنے ملک کی کہانی لکھو۔ دیکھتے نہیں، وہ جوش میں آکر کہتا ہے، "یہ ملک دنیا کی تاریخ کو دفن کر چکا ہے۔" ایسے موقعوں پر اسے دیکھ کر مجھے دکھ ہوتا ہے۔ وہ ایسے لوگوں میں سے ہے جنہیں عظمت چھو کر نکل جاتی ہے۔ بیس برس پہلے مجھے کیا خبر تھی کہ ہم ایک ایسے دور میں داخل ہو رہے ہیں جہاں ہماری ایک نسل کی نسل کا یہی حشر ہوگا۔ وہ لوگ اب کہاں ہیں، مبشر نے ایاز کے ساتھ ہی سیاسی جماعت میں شمولیت کی تھی۔ ہوتے ہوتے وہ صوبائی وزیر کے عہدے تک پہنچا۔ مگر آدمی ہوشیار تھا۔ وقت کی رفتار پہچان کر اچھے موقعے پر مستعفی ہو گیا اور پریکٹس کی جانب لوٹ آیا۔ آج کل وہ چوٹی کا وکیل ہے اور حکومت سے بھاری فیس وصول کر کے اپنی سابقہ پارٹی کے لوگوں کے خلاف مقدموں کی وکالت کرتا ہے۔ فیاض نے پہلے چار پانچ سالہ دور میں رسوخ حاصل کر کے بہت ساری جائیداد اکٹھی کر لی تھی۔ پھر اس نے ایک پریس لگا لیا اور اخبار نویسی سے ریٹائر ہو کر کاروبار میں لگ گیا۔ فیاض اور خلیق کی آخری دم تک دوستی رہی۔ وہ دونوں ہر روز بلاناغہ شام کے وقت شہر کے ایک فیشن ایبل ریستوران

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں اپنے چند دوستوں کے ہمراہ موجود ہوتے تھے اور رات گئے تک وہاں بیٹھے رہتے تھے۔ اسی ریسٹوران میں ایک شام کو خلیق کھانا کھاتے کھاتے اوندھے منہ میز پر گرا اور انتقال کر گیا۔

صرف نسیم اس ابتلا سے سُرخرو ہو کر نکلی ہے۔ اس نے اپنی روش نہیں بدلی۔ اچھے وقت میں اور برے میں وہ برابر ایاز کے پہلو میں ثابت قدمی سے کھڑی رہی ہے۔ اس کے والدین فوت ہو چکے ہیں۔ دونوں بیٹے امریکہ اور جرمنی میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ وہ ہفتے میں ایک بار ایاز سے ملاقات کے لیے جاتی ہے۔ میری ملاقات اکثر جیل میں ہی نسیم سے ہو جاتی ہے۔ پھر عموماً میں وہاں سے اس کے ساتھ گھر چلا آتا ہوں۔ گھر میں صرف ایک ملازم رہ گیا ہے جو نسیم کا سارا کام سنبھالتا ہے۔ کوٹھی ویران پڑی ہے۔ اظہر اور اس کی بیوی کبھی کبھی نسیم سے ملنے کے لیے آتے رہتے ہیں۔ (انہیں ایاز اور نسیم سے کچھ شکایتیں ہیں جو اس وقت سے تعلق رکھتی ہیں جب ایاز اقتدار میں تھا۔) باقی وقت وہ گھر میں اکیلی رہتی ہے۔ بیٹوں کے خط پڑھتی ہے اور کئی کئی دن تک ان کے جواب لکھتی رہتی ہے۔ اس کے کمرے میں پرانے اخباروں اور رسالوں کے ڈھیر پڑے ہیں جن میں ایاز کی اور اس کی تصویریں چھپی ہوئی ہیں۔ کبھی کبھار وقت گزاری کے لیے انہیں اٹھا کر پڑھتی ہے۔ مگر بیشتر وقت وہ اب اپنے کمرے میں کرسی پہ بیٹھی کھڑکی سے باہر دیکھتی رہتی ہے، جہاں باغ میں جگہ جگہ پہ گھاس اگ آئی ہے۔ شام کے وقت دیر تک اس کے کمرے میں بتی نہیں جلتی۔ اس کے چہرے کے نقوش ڈھے گئے ہیں۔ مگر وہ لباس کے معاملے میں ابھی تک خاصی محتاط ہے۔ اس کی عمر بھر کی یہ ایک عادت ایسی ہے جو برابر چلی آ رہی ہے۔ اس کا ذوق شروع سے بہت عمدہ رہا ہے، اور جب بھی میں اس سے ملتا ہوں صاف ستھرا اور نفیس لباس اس کے زیبِ تن ہوتا ہے۔ مگر میرے چہرے پر آنکھیں لگی ہیں، میں دیکھ سکتا ہوں۔ لباس کے اندر وہ ہڈیوں کی موٹھ ہو چکی ہے۔ کئی بار مجھے خیال آتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے کہ اس عورت کو کس بات کا صلہ مل رہا ہے۔ اس نے ایک باعزت اور باوقار زندگی بسر کی ہے۔ مجھے دکھ ہوتا ہے۔

جہاں تک میری زندگی کا تعلق ہے، خدا کا شکر ہے، بسر ہو رہی ہے۔ مگر بیس سال سے میں نے کوئی کہانی نہیں لکھی۔ البتہ ڈائری باقاعدگی سے لکھتا ہوں۔ ڈائری میں میں اپنے اوپر گزرے ہوئے واقعات قلم بند کرتا رہتا ہوں۔ فقط!

+++

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

واپسی کا سفر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس مکان میں ہم اٹھارہ مرد رہتے تھے۔ یہ مکان مدّت سے مسماری کے پروگرام میں آ چکا تھا، مگر ابھی تک کھڑا تھا۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب میں پہلے پہل اپنے ملک کو چھوڑ کر یہاں آیا تھا۔ شہر لندن میں میں ایک ہفتے تک ٹھہرا رہا، مگر وہاں میرا کام نہیں بنا۔ جو آدمی ہمیں ادھر لے کر آیا تھا وہ جاتے جاتے ایک دو پتے دے گیا تھا تاکہ سر چھپانے کی جگہ مل جائے۔ ایک پتے کو پوچھتا ہوا میں برمنگھم آنکلا۔ یہاں پہنچ کر قسمت نے مدد کی، دو چار دن کے اندر ہی مجھے کام مل گیا اور میں یہیں پر رُک گیا۔ اس طرح اگلے دو سال کے لیے برمنگھم میرا شہر، اور وہ مکان میرا گھر بن گیا۔ پھر اُس گھر میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے بم کے دھماکے کی طرح اُچھال کر ہمیں اِدھر اُدھر بکھیر دیا۔ ہم سب غیر قانونی طور پر اس ملک میں داخل ہوئے تھے اور کام کاج کر رہے تھے۔ جس روز وہ واقعہ پیش آیا ہم سب اُٹھ کر وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ جو چار پانچ آدمی اُس وقت گھر میں موجود تھے ان کو سامان باندھنے کا موقع مل گیا۔ باقی کے باہر ہی باہر سے غائب ہو گئے۔ جس طرف کسی کا مُنہ اٹھا اُسی طرف کو نکل گیا۔ مَیں گرتا پڑتا ہوا اسکاٹ لینڈ جا پہنچا اور کئی برس تک گلاسگو میں رہتا رہا۔ اس بات کو ایک عرصہ گزر چکا ہے، مگر اُس دن سے لے کر آج تک مجھے اُن آدمیوں میں سے کسی ایک کی شکل نظر نہیں آئی۔ میں سوچتا ہوں پیر کا چکّر تو قسمت کا چکّر ہے، ایک زندگی کا چکّر الگ ہے جو اس سے بھی اندھا چکّر ہے۔ اُس زمانے سے صرف ثاقب ایک ایسا آدمی ہے جس سے سال میں ایک دو بار ملاقات ہو جاتی ہے۔ مگر ثاقب کی بات دوسری ہے۔ اوّل تو اس کی ایک خاص جگہ مقرر ہے جہاں وہ موجود رہتا ہے۔ دوم ثاقب کا اس واقعے سے گہرا تعلق ہے جس نے ہمارے بسے بسائے گھر کو اُجاڑ کے رکھ دیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اب زندگی خاصی آسان ہو گئی ہے۔ کئی سال کی دربدری کے بعد اب مجھے اس ملک کی شہریت مل چکی ہے۔ آخری دنوں میں اپنے ہی ایک آدمی نے مخبری کر دی تھی جس کی وجہ سے مجھے تین مہینے کی جیل کاٹنی پڑی۔ مگر خوش قسمتی سے اُنہیں دنوں کے اندر یہاں کا قانون بدل گیا۔ اس سے پہلے میرا وکیل مقدمہ لڑ رہا تھا۔ اُس نے حکومت کو بتایا کہ مجھے یہاں رہتے ہوئے اور کام کرتے ہوئے پانچ سال سے زیادہ ہو گئے ہیں اور میں نے پورا ٹیکس ادا کیا ہے۔ علاوہ ازیں کسی چھوٹے بڑے جرم میں ملوّث نہیں ہوا۔ مارگریٹ میکنگرٹ کا قصہ بھی بیچ میں آ گیا جس کے ساتھ گلاسکو میں میرا تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ مَیں اُسی کے گھر میں رہائش پذیر تھا۔ مارگریٹ سے میرا ایک بیٹا بھی تولّد ہوا تھا، گو نکاح کی نوبت کبھی نہیں آئی، نہ ہی میرا کوئی ارادہ تھا۔ کیونکہ میرے بیوی بچے پیچھے موجود تھے۔ میری کوشش تھی کہ اس قصّے کا ذکر بیچ میں نہ لایا جائے۔ مگر میرے وکیل نے بتایا کہ ادھر یہ کوئی غیر قانونی بات نہیں، بلکہ اس کی وجہ سے میرا کیس اور بھی مضبوط ہو جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ پھر اس دوران میں ملک کا قانون بدل گیا اور مجھے یہاں رہنے کی کھلی آزادی مل گئی۔ سکاٹ لینڈ کی سردی نے میری ہڈیاں جما دی تھیں۔ آزاد ہوتے ہی میں وہاں سے منتقل ہو کر ادھر لندن کے قریب آ گیا۔ یہاں کا موسم اچھا ہے اور مجھے پوسٹ آفس میں ملازمت مل گئی ہے۔ حکومت کی پکّی نوکری ہے، اس میں اوور ٹائم بہت لگتا ہے، جتنی ڈیوٹی اُتنا اوور ٹائم۔ میں نے اپنا مکان خرید لیا ہے اور اپنے بیوی بچوں کو بھی اپنے پاس بُلا لیا ہے۔ مارگریٹ سے اب میرا کوئی تعلق نہیں رہا۔ بس اپنے بیٹے ماجد کو جس کا نام مَیں نے اپنے چچا کے نام پہ رکھا ہے، باقاعدگی سے خرچہ بھیجتا ہوں۔ وہ آرام سے مارگریٹ کے دوسرے کر دو بچوں کے ہمراہ پرورش پا رہا ہے۔ میں کہتا ہوں کیا فرق پڑتا ہے، یہاں رہے یا وہاں، آخر بیٹا تو میرا ہی ہے۔ بڑا ہو گا تو ایک دن خود ہی چل کر میرے پاس آ جائے گا۔ میرے بچے اب میرے پاس رہتے ہیں، انگریزوں کی طرح انگریزی بولتے ہیں۔ زندگی اب کافی مطمئن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوگئی ہے۔ مگر دن رات یہاں پر سر اُٹھانے کی مہلت نہیں ملتی۔ آج کل میں ہسپتال میں پڑا ہوں تو کچھ فرصت ملی ہے، دن بھر خاموش لیٹا رہتا ہوں، پرانی پرانی باتیں یاد آتی ہیں۔ میں عمر میں پہلی بار ہسپتال میں داخل ہوا ہوں۔ اپنی طرف تو ہسپتال میں داخل ہونے کا رواج ہی نہیں تھا۔ گھر پر پڑے پڑے درست ہو جایا کرتے تھے۔ ویسے بھی میری صحت اچھی واقع ہوئی ہے۔ خدا کا شکر ہے، کبھی کوئی بیماری نہیں لگی۔ یہ بھی ایک معمولی سے حادثے کی وجہ سے ہسپتال میں آنا پڑا ہے، کوئی بیماری وغیرہ نہیں۔ میرے بس میں ہو تو ابھی اُٹھ کر کام پر چلا جاؤں۔ مگر یہاں ڈاکٹر کا حکم چلتا ہے۔ مجھے لٹا رکھا ہے۔ کئی دن سے ٹسٹ ہو رہے ہیں۔ ویسے میں آرام سے ہوں۔ ہسپتال کیا ہے ایک عالیشان عمارت ہے۔ جیسے کوئی محل ہو۔ چمکتا ہوا فرش اور سفید براق بستر۔ نرسیں اور ڈاکٹر زیادہ تر ہمارے وطن کے ہیں یا افریقہ کے کالے ہیں۔ اُن کی وردیاں بھی سفید براق ہیں۔ کھانے کا انتظام بہت عمدہ ہے، پیشاب پاخانے کے برتن صاف ستھرے ہیں، جیسے کوئی اعلیٰ درجے کا ہوٹل ہو۔ مگر عجیب بات ہے کہ جب سے یہاں پر آیا ہوں میرے دل میں بے وطنی کا احساس بڑھ گیا ہے اور کوئی تکلیف نہیں، مگر دل بے چین رہنے لگا ہے۔ پہلے پہل کی باتیں خیال میں آتی رہتی ہیں، اپنے ملک کی باتیں اور اس ملک کی باتیں، جیسے پچھلی زندگی آنکھوں کے سامنے سے گزرتی جا رہی ہو۔

ایک خاص بات ان دنوں میں ایسی ضرور ہوئی ہے جس کی وجہ سے برمنگھم کا زمانہ مجھے ہر وقت یاد آتا رہتا ہے۔ ہسپتال میں آنے سے کچھ دن پہلے میں ثاقب سے ملنے کے لیے گیا تھا۔ وہاں میں نے ثاقب کی واپسی کی خبر سنی، جس نے میرے دل کو بے حد رنجیدہ کر دیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، اُس زمانے کی ایک ایک بات میرے دماغ میں آتی چلی جاتی ہے، جیسے ایک لڑی میں پروئی ہوئی ہو۔ اور برمنگھم کا وہ مکان جہاں میں نے پہلے دو سال گزارے تھے ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تصویر کی طرح میرے دل میں آموجود ہوتا ہے۔ جب سے میں نے وہ جگہ چھوڑی ہے میں وہاں لوٹ کر نہیں گیا۔ اطلاع یہ ہے کہ وہ سارے کا سارا علاقہ میونسپلٹی نے گرا دیا ہے اور اُس کی جگہ نئے مکان بن رہے ہیں۔ مگر جہاں تک میری یاد کا تعلق ہے وہ مکان ویسے کا ویسا اپنی جگہ پر کھڑا ہے، جیسے کل کی بات ہو۔

اُس مکان میں ہم اٹھارہ مرد رہتے تھے۔ مکان کا مالک ایک بُڈھا یہودی تھا۔ جنگ کے بعد اس نے کئی پُرانے مکان سستے داموں سے خرید لیے تھے۔ یہ مکان اُس نے کرائے پر چڑھا رکھے تھے اور خود شہر کے ایک امیر علاقے میں رہتا تھا۔ کسی زمانے میں ہمارا علاقہ بھی اس شہر کے صاف ستھرے علاقوں میں گنا جاتا تھا۔ یہاں محنت مزدوری کرنے والے خانہ دار لوگ ایک ایک دو کمرے کرائے پر لے کر رہتے تھے۔ رضا علی نے مجھے بتایا تھا کہ ان لوگوں کی عورتیں شام کے وقت ڈٹ ہاتھوں کی صفائی کیا کرتی تھیں۔ رضا علی اُس وقت اس ملک میں آیا تھا جب جنگ ابھی نئی نئی ختم ہوئی تھی۔ مگر اُنیس سو پچاس کے بعد یہاں پر بڑی تعداد میں دوسرے ملکوں سے لوگ آنے شروع ہوتے۔ زیادہ تر ہمارے وطن کے لوگ اور افریقہ کے کالے لوگ تھے۔ پانچ دس سال کے اندر گوروں کے اس شہر میں پیلے لوگوں کی کثرت ہو گئی۔ یہ دیکھ کر ان لوگوں نے ایسی جان ماری کہ اپنے مکان خریدنے کے قابل ہو گئے۔ اُس زمانے کی یہ سب باتیں مجھے رضا علی کی زبانی معلوم ہوئی تھیں۔ رضا علی سُورت کا رہنا والا تھا۔ اُس نے بارہ سال کی عُمر میں بحری جہازوں پر کام کرنا شروع کیا تھا اور ساری زبانیں بولتا تھا۔ سورتی، بنگالی، مدراسی، پنجابی، سب۔ ایک بار اُس کا جہاز اس ملک سے گزرا تو رضا علی یہیں پر رہ گیا۔ میرے خیال میں وہ اس جگہ کا سب سے پرانا رہنے والا تھا۔

رضا علی کا کہنا تھا کہ کرائے کے مکانوں کی وجہ سے یہ علاقہ پہلے ہی کافی خستہ حال ہو چکا تھا۔ پھر ہمارے لوگوں کی شکل دیکھتے ہی گورے لوگ یہاں سے بھاگنے لگے۔ مکانوں کی قیمتیں گر گئیں اور اپنے لوگوں نے آسان قسطوں پر ان کے مکان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خرید لیے۔ جو کرایے دار گورے آپ سے آپ گئے وہ گئے، جو نہ گئے ان کو مرچوں کی دھونی دے کر نکالا گیا۔ ان کی جگہ وطن سے نئے آنے والوں کو کمروں میں بھر لیا گیا۔ جب ہمارے لوگوں کی آبادی بڑھی تو اپنی دکانیں کھلنے لگیں۔ آٹا، دال، مرچ، گرم مسالہ، حلال گوشت جھٹکا گوشت، اصلی گھی کی مٹھائیاں، سرسوں کا ساگ، کچے ملے، سبز مرچ، آہستہ آہستہ سب کچھ ملنے لگا۔ دیسی کھانے کے ہوٹل کھل گئے۔ اب تو یہ حالت ہے کہ گورے لوگ بھاگ بھاگ کر ہمارے ہوٹلوں میں جاتے ہیں، سالن روٹی کھاتے ہیں اور پانی کے گلاس چڑھا کر ڈکار لیتے ہیں۔ مگر پہلے پہل سنا ہے کہ ادھر سے گزرتے ہوئے ان کی آنکھوں سے پانی بہنے لگتا تھا۔ بڑی بڑی گلیوں میں رہنے والے لوگوں نے میونسپلٹی سے اجازت حاصل کر کے اپنے گھروں کی بیٹھکوں میں چھوٹے چھوٹے کیفے کھول لیے۔ یہ کیفے اُس وقت ان بے وطنوں کی زندگی کا مرکز ہوا کرتے تھے۔ آج کل تو نقشہ بدل چکا ہے۔ ہم لوگ اب اس ملک میں رہنے سہنے لگے ہیں۔ کام کاج ہے، بیوی بچے ہیں، آپس کی میل ملاقات ہے، مندر اور مسجدیں تیار ہو گئی ہیں، کمیٹیاں بن گئی ہیں، جیب میں پیسا ہے، کار ہاتھ کے نیچے ہے، ٹیلی وژن لگا ہوا ہے، بچوں کی برتھ ڈے ہوتی ہے، وقت اچھا گزر جاتا ہے۔ ان دنوں میں یہ چیزیں ابھی جاری نہیں ہوئی تھیں۔ یہ کیفے ہی ایسی جگہیں تھیں جہاں وقت گزرتا تھا اور روزگار کے بارے میں معلوم کیا جاتا تھا۔ اپنے اپنے علاقوں کے لوگ گروہ بنا کر میزوں کے گرد بیٹھے رہتے تھے۔ نئے آنے والوں کو ملک کے طور طریقے اور دفتری کارروائیاں سمجھائی جاتی تھیں۔ سارا دن ریکارڈ بجتے رہتے تھے۔ یہ کیفے شاید پہلی ایسی جگہیں تھیں جہاں سے اس سرزمین پر ہماری غزلوں اور قوالیوں کی سُریلی آواز بلند ہوئی تھی۔ کئی سال کے بعد انہیں کیفوں میں سے ایک کے اندر رضا علی سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ اب بوڑھا ہو چکا تھا۔ سارا دن وہ ایک سے دوسرے کیفے میں آتا جاتا رہتا۔ اُس کا کسی ایک گروہ کے ساتھ میل جول

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رتھا بلکہ بنگالیوں، پنجابیوں سب کے ساتھ اُٹھتا بیٹھتا تھا۔ لوگ سارا دن اس کو چائے خرید خرید کر پلاتے رہتے تھے، کیونکہ رضا علی یہاں کی سب دفتری کارروائیاں سمجھتا تھا اور ہر مسئلے پر اپنی رائے دینے کے لیے تیار رہتا تھا۔ رضا علی دل کا بہت اچھا تھا۔ اُس کی زندگی عجیب گزری تھی۔ بارہ سال کی عمر میں اس نے سمندری جہازوں پر کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ سال میں ایک دو بار وہ اپنے گاؤں کا چکر لگا آتا تھا۔ ایک بار وہ گاؤں گیا تو اُس کی شادی ہو گئی۔ اُس وقت وہ سولہ سال کا تھا۔ رضا علی کی ایک لڑکی تھی جو شادی شدہ تھی۔ رضا علی کے پاس تصویریں تھیں جو اُس نے مجھے دکھائیں۔ زیادہ تر اُس کی اپنی جوانی کی تصویریں تھیں جن میں وہ اپنے جہازی دوستوں کے ساتھ گلے میں باہیں ڈالے بندرگاہوں پر اور جہازوں پر کھڑا تھا۔ باقی کی اس کی بیٹی کی تصویریں تھیں۔ اس کی بیٹی کے بچپن، جوانی اور شادی شدہ ہونے کی تصویریں تھیں۔ کچھ اس کی بیٹی کے بچوں کی تصویریں تھیں۔ ان بچوں کو رضا علی نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کی تصویریں اس نے لفافے میں سنبھال کر رکھی ہوئی تھیں۔ رضا علی نے مجھے بتایا کہ وہ اپنی عمر میں صرف دس پندرہ مرتبہ اپنی بیوی سے ملا تھا، اور کبھی ایک مہینے سے اُوپر اُس کے ساتھ نہیں رہا، مگر چالیس سال سے باقاعدہ اُس کو خرچہ بھیج رہا ہے۔ ”جدھر بھی گیا“ وہ بتایا کرتا تھا، ”تیس تاریخ کو پیسا پیچھے بھیج دیا۔ کبھی ناغہ نہیں کیا۔“ وہ تیس سال سے اس ملک میں ایک کمرے کے اندر رہ رہا تھا۔ اس عرصے میں صرف ایک بار دو ہفتے کے لیے پیچھے اپنے گاؤں کو گیا تھا، جب اُس کی بیٹی کی شادی ہوتی تھی۔ میں نے ایک بار اس سے دریافت کیا کہ وہ اپنی بیوی کو ادھر کیوں نہیں لے کر آیا، تو بولا کہ اُس کی بیوی اُدھر گاؤں میں خوش ہے۔ بس۔ پہلے پہل سُنا تھا کہ رضا علی یہاں کچھ عرصے تک ایک گوری عورت کے ساتھ رہتا رہا تھا، مگر پھر اُسے چھوڑ کر الگ اپنے کمرے میں آ گیا۔ ادھر وہ سالوں سال چھوٹی موٹی فیکٹریوں میں کام کرتا رہا، اور شام کو کیفوں اور ریستورانوں میں بیٹھ کر اپنے لوگوں سے آہستہ آہستہ باتیں کیا کرتا، جیسے کوئی منتر جپ رہا ہو۔ اس کی زندگی اسی طرح دن بدن گزرتی گئی۔ دیکھنے میں لگتا تھا کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سو سال تک اسی طرح چلتا جائے گا۔ مگر آخری دنوں میں اُس کی صحت خراب ہو گئی تھی۔ جب میرا اُس سے میل جول ہوا اُس کے ایک سال کے اندر اندر اُس کا انتقال ہو گیا۔ کچھ سورتی لوگوں نے مل جل کر سوشل محکمے کی مدد سے رضا علی کے کفن دفن کا انتظام کر دیا۔ محکمے والوں نے اُس کے پرانے کپڑے جلا دیے اور کاغذات اور تصویروں کا بنڈل بنا کر ڈاک کے ذریعے اُس کے پتے پر پیچھے گاؤں بھیج دیا۔ رضا علی نے کوئی ترقی نہیں کی۔ جس سستے زمانے میں وہ آیا تھا محنت کر کے بہت ترقی کر سکتا تھا۔ مگر رضا علی کی عادت پکی ہو چکی تھی۔ وہ سمندری جہازوں کی طرح ادھر سے اُدھر ہی آتا جاتا رہا۔ وہ بڑا سخت زمانہ تھا۔ ہم لوگ تو بعد میں یہاں پہنچے ہیں۔ مگر پہلے پہل کے وہ دن اس ملک میں ہمارے لوگوں کے لیے اصل بے وطنی کے دن تھے۔ حالانکہ ہم لوگ جب یہاں آئے اُس وقت بھی زندگی آسان نہ تھی۔ آج کل تو حالات بڑے بہتر ہو گئی ہے، مگر ہمارے وقت میں بھی مارا ماری کا عالم تھا۔ لوگوں کے آنے جانے پر بندش لگ چکی تھی۔ بیوپاریوں کے شور مچانے پر حکومت نے قانون بدل دیا تھا اور ہم لوگوں کا داخلہ ادھر بند ہو گیا تھا۔ پھر سمگل کرنے کا کاروبار شروع ہوا۔ ہمارے وقت کے سب لوگ سمگل ہو کر ادھر آئے تھے۔ میں نے خود اپنی بیوی کا زیور بیچ کر پانچ ہزار کی رقم خرچ کی تو پھر ایجنٹ نے پاسپورٹ بنوا کر دیا، وہ بھی جعلی۔ اُس کے بعد ہم جس طرح لاریوں اور ٹرکوں میں چھُپ چھُپا کر یہاں تک پہنچے، اور رستے میں ہم پر کیا گزری، یہ ایک الگ کہانی ہے۔ پھر یہاں پہنچنے کے بعد مزید قرضہ سر پر چڑھا۔ اُس زمانے میں کارڈ پچاس پونڈ کا بنتا تھا۔ پھر کام حاصل کرنے کے لیے سو پونڈ اپنے ہی ایک بھائی کو دینے پڑے جس نے فورمین سے کہہ سن کر اپنی فیکٹری میں کام پر لگوا دیا۔ یہ قرضے اور اس ایجنٹ کے قرضے جس نے ہم کو یہاں سمگل کیا تھا اتارتے اتارتے دو سال لگ گئے۔ پھر اُدھر سے گرفتاری کا فکر، کہ پکڑے گئے تو سب کچھ غارت۔ مگر کم از کم ایک بات کی تسلی تھی۔ ہم سب ایک ہی کشتی کے مسافر تھے۔ ایک بار اِدھر کے طور طریقوں کا علم ہو گیا تو پھر کچھ آزادی سے گھومنے پھرنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لگ گئے۔ مگر پہلے پہل ہم سب اس مکان کے اندر بند ہو کر بیٹھے رہتے تھے، جیسے اٹھارہ قیدی ہوں۔ ان دنوں میں جیسی واقفیت میری اس گھر سے ہوئی شاید کسی قیدی کی قید خانے کی دیواروں سے بھی نہ ہوگی۔

ہماری ساری زندگی گھر کے اندر بسر ہوتی تھی۔ جو زندگی گلیوں اور بازاروں میں اور کچھ دوستوں عزیزوں سے ملنے ملانے میں اور کچھ سیر و تفریح میں گزر جاتی ہے، ہماری وہ ساری کی ساری گھر کی چار دیواری کے اندر گزرتی تھی۔ یہودی بڑی چالاک قوم ہے۔ انہوں نے اپنا ایک مکان بھی ہمارے لوگوں کے ہاتھ نہ بیچا بلکہ صرف کرایے دار بدل دیے۔ اب گوروں کی بجائے ہمارے لوگ ان کے کرایے دار بن گئے۔ ان مکانوں کی مرمت پر وہ ایک پیسا بھی خرچ نہ کرتے تھے اور کرایہ ڈبل لیتے تھے۔

ہمارا اسی طرح کا مکان تھا جس کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ یہ ملکہ وکٹوریہ کے زمانے کا بنا ہوا مکان تھا اور ایسا دکھائی دیتا تھا کہ اس وقت سے لے کر آج تک اس کا پلستر اکھڑ رہا ہے۔ دیواروں پر بیل چڑھی ہوئی تھی اور جگہ جگہ پر پلستر کے ڈھول بنے ہوئے تھے۔ چھتوں سے ہر وقت سفیدی کے ذرّے گرتے رہتے تھے جیسے برفباری کی پھوار پڑتی ہے۔ یہ چونا سانس کے اندر جا کر صحت کے لیے بڑا خطرناک ثابت ہوا۔ کئی ایک کو خشک کھانسی لگ گئی۔ نزلہ زکام کھانسی بلغم چھاتی کا درد سارے گھر میں پھیل گیا۔ غلام محمد بیچارے کو نمونہ ہو گیا۔ کئی دن تک پڑا پڑا کراہتا رہا۔ قسمت اچھی تھی بچ گیا۔ آہستہ آہستہ ڈاکٹروں کے پاس جانے لگے تو کچھ آرام آیا۔ مگر پہلے چھ مہینے تک کسی کی ہمت نہ پڑی کہ ڈاکٹر کا کارڈ بنواتے، اس ڈر سے کہ ڈاکٹر حکومت کو شکایت نہ کر دے۔ مگر یہاں کے ڈاکٹر اچھے ہیں، ان کا کام صرف بیماری کا علاج کرنا ہے۔ ہمارے ڈاکٹروں کی طرح لالچ نہیں کرتے اور نہ غلط دوائی دیتے ہیں۔ جب چھ مہینے کے بعد ڈاکٹری کارڈ بنوا لیے تو پھر بھی کبھی ڈاکٹر کو گھر پر نہیں بلایا۔ حالانکہ ٹیلی فون لگا ہوا تھا اور کارڈ کے اوپر درج تھا کہ ڈاکٹر کو گھر پر بلانے کا ہم کو حق ہے۔ مگر اس زمانے میں